ماہنامہ

النجم

لائف لائن یا سراب: دریائے سندھ کا سچ

معیشت کا جنازہ صوبائی لوٹ سیل

انسانیت کس مقتل کی طرف بڑھ رہی ہے؟

صوبائی خود مختاری کا ڈرامہ

جولائی 2026

ایڈیٹر : ابو حیان سعید

ایڈیٹوریل :

نایان (Nayan) منگول سلطنت کے شاہی خاندان "بورجگین" کا ایک شہزادہ اور ایک طاقتور فوجی کمانڈر تھا، جو چنگیز خان کے سب سے چھوٹے سگے بھائی **تیومگے** (Temüge) کی چوتھی یا پانچویں نسل میں سے تھا۔ تاریخ میں وہ قوبلائی خان کے خلاف ایک بہت بڑی اور مشہور بغاوت کی قیادت کرنے کی وجہ سے جانا جاتا ہے۔

نایان کے بارے میں زیادہ تر تاریخی تفصیلات وینس کے مشہور سیاح **مارکو پولو** کے سفر نامے سے ملتی ہیں، جس نے خود اس دور کے واقعات کو دیکھا تھا۔

نایان سے جڑے اہم تاریخی حقائق درج ذیل ہیں:

1۔ نایان کا مذہب اور اس کا اثر

منگول اشرافیہ میں جہاں بدھ مت اور شمن پرستی (Shamanism) کا رجحان بڑھ رہا تھا، وہیں نایان ایک **نسٹوریائی عیسائی** (Nestorian Christian) تھا۔ مارکو پولو کے مطابق، جب نایان نے قوبلائی خان کے خلاف جنگ لڑی تو اس کے فوجی جھنڈوں پر عیسائیوں کا مقدس نشان "صلیب" (Cross) بنا ہوا تھا اور اس کی فوج میں بہت سے منگول عیسائی بھی شامل تھے۔

2۔ قوبلائی خان کے خلاف بغاوت (1287ء)

نایان منچوریا اور منگولیا کے ارد گرد کے وسیع علاقوں (مشرقی اولوس) کا حاکم تھا اور روایتی خانہ بدوش طرزِ زندگی کا حامی تھا۔ جب قوبلائی خان نے چین کو فتح کر کے وہاں "یوآن خاندان" کی بنیاد رکھی اور چینی طرزِ حکومت اور ثقافت کو اپنانا شروع کیا، تو نایان سمیت کئی منگول شہزادے اس کے خلاف ہو گئے۔ ان کا ماننا تھا کہ قوبلائی خان منگولوں کی قدیم روایات کو بھول رہا ہے۔

اتحاد: نایان نے وسطی ایشیا کے ایک اور طاقتور منگول حکمران **قائیدو** (Qaidu - جو اوگتائی خان کا پوتا تھا) کے ساتھ مل کر قوبلائی خان کو دونوں طرف سے گھیرنے کا منصوبہ بنایا۔
فوج کی تعداد: مارکو پولو کے مطابق، نایان نے تقریباً 300,000 گھڑ سواروں پر مشتمل ایک بہت بڑی فوج جمع کر لی تھی۔

3. فیصلہ کن معرکہ اور قوبلائی خان کی حکمتِ عملی

جب قوبلائی خان کو اس خطرے کا علم ہوا تو اس نے نایان اور قائیدو کو آپس میں ملنے سے روکنے کے لیے فوری قدم اٹھایا۔ قوبلائی خان اس وقت کافی بوڑھا اور بیمار تھا، لیکن اس کے باوجود اس نے خود فوج کی کمان سنبھالی اور انتہائی تیز رفتاری سے نایان کے علاقے (منچوریا) کی طرف پیش قدمی کی۔
قوبلائی خان نے نایان کی فوج کو اس وقت حیران کر دیا جب وہ صبح کے وقت بالکل بے فکر اپنے خیموں میں سو رہے تھے۔ دونوں فوجوں کے درمیان ایک شدید اور خونریز جنگ ہوئی۔ مارکو پولو کے مطابق، یہ اس دور کی سب سے بڑی جنگوں میں سے ایک تھی جس میں لاکھوں گھڑ سوار آمنے سامنے تھے۔

4. نایان کا انجام

اس جنگ میں قوبلائی خان کو فتح حاصل ہوئی اور نایان کو گرفتار کر لیا گیا۔ منگولیا کی قدیم روایت کے مطابق، شاہی خاندان کے کسی بھی فرد کا خون زمین پر بہانا منحوس سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ نایان کو موت کی سزا دینے کے لیے ایک خاص طریقہ اپنایا گیا:
نایان کو ایک بڑے قالین (یا نمدے) میں مضبوطی سے لپیٹ دیا گیا اور پھر اسے اس وقت تک بے رحمی سے ہلایا اور پٹخا گیا (یا گھوڑوں کے پیروں تلے روندا گیا) جب تک کہ قالین کے اندر ہی اس کی جان نہ نکل گئی۔ اس طرح اس کا ایک قطرہ خون بھی زمین پر نہیں گرا۔

نایان کی شکست کے بعد قوبلائی خان نے مشرقی منگول شہزادوں کی خود مختاری کو ختم کر دیا اور سلطنت پر اپنی گرفت مزید مضبوط کر لی۔

کہا جاتا ہے کہ منگول کمانڈر نایان ایک بار کسی شہر کو فتح کرنے کے بعد وہاں کی گلیوں بازاروں سے گزر رہا تھا ۔
وہ کچھ مقامی لوگوں کے ہاتھ پاؤں کاٹ دیتا اور کچھ کو معاف کر دیتا -----
منگول فوجی لوگوں کی گردنیں دبوچ کر نایان کے سامنے لاتے ۔ وہ ان کے جسموں میں خنجر گھونپتا اور آگے بڑھ جاتا ---
اچانک وہاں ایک آدمی نایان کے قدموں میں گر کر چیخنے لگا ، سپاہیوں کے اٹھانے پر وہ شخص نایان سے بولا

حضور میرے جرائم اتنے زیادہ ہیں کہ آپ چاہتے ہوئے بھی معاف نہیں کر سکتے ، میں نے لوگوں کو لوٹا ، ستایا ، برباد کیا ہے آپ تلوار سے میری گردن کاٹ دیں
نایان ایک منٹ کے لیے رُکا ، آنکھیں بند کیں اور کچھ سوچنے لگا ۔ پھر اچانک اس نے تلوار آدمی کی گردن پر رکھتے ہوئے کہا ،

کیا دنیا میں ایسی کوئی جگہ ہے جہاں اس مجرم کو معافی مل سکے ؟
ایک دانا بلند آواز میں بولا جی ہاں حضور مستقبل میں ایک جگہ ہو گی ۔
نایان نے حیرانگی سے دریافت کیا کہ وہ کونسی جگہ ہو گی ؟

دانا بولا، حضور جنوبی ایشیا کا ایک ملک ہو گا " اسلامی جمہوریہ پاکستان "
وہاں پر ایسے جرائم پیشہ لوگوں کو نہ صرف معافی ملے گی بلکہ اسکے ساتھ ساتھ وزارتیں بھی دی جائیں گی ۔

جتنا بڑا مجرم ہوگا اتنا بڑا عہدہ -----

لائف لائن یا سراب: دریائے سندھ کا سچ

ابو حیان سعید

سب سے پہلی بات یہ کہ عشق و محبت کا شعور جین زی کے بعد تقریبا ختم ھی سمجھیں ۔ جین الفا کے پاس بہت کچھ ھوگا لیکن عشق و محبت نایاب ھوگی ۔
سندھ میری جنم بھومی ھے ، سندھ ھی میری آن بان ھے ، کراچی کے ساحل سے کشمور تک سندھ میری دھرتی ھے ، سندھ میری پہچان ھے ، سندھ کمزور تو میں بھی کمزور، سندھو دریا سے محبت خمیر میں شامل ھے اور سندھو دریا کے پانی پر ھر حقدار کو اس کا جائز حق ملنا ھی سندھو دریا کی عظمت کی نشانی ھونی چاہیئے ، سندھ کے وسائل پر قبضہ اور لوٹ مار کرنے والوں کا میں جانی دشمن ھوں، سندھ کو ملنے والےاین ایف سی ایوارڈ کے سات ارب ڈالر کا حساب کتاب نہ دینے والوں کے خلاف میرا اعلان جنگ ھے، سندھ سے عشق اور محبت کا مطلب یہ کیسے ھو سکتا ھے کہ سندھ کو لوٹنے والے وڈیروں کی ھمہ وقت جی حضوری کی جاتی رھے اور وڈیروں کی غلاظت کو گلاب جامن سمجھ کر کھایا جائے، بہت سارے ایسا کر بھی رھے ھیں تو سائیں فارم 47 والی جمہوریت ھے میرے سندھی بھائ جو دل چاھے کھاتے اور اٹھاتے رھیں لیکن مجھے اس مقدس کام (کھانے اور اٹھانے) سے معذور سمجھا جائے ۔

کراچی، پاکستان کا معاشی انجن اور ساڑھے تین کروڑ سے زائد آبادی کا بے ھنگم جنگل ، دنیا کے ان چند بڑے شہروں میں شامل ہے جو سمندر کے کنارے آباد ہونے کے باوجود پانی کی ایک ایک بوند کو ترستے ہیں۔ عشروں سے سرکاری دستاویزات اور نصابی کتابوں میں تو یہ پڑھایا جاتا ہے کہ کراچی کو پانی " دریائے سندھ " سے ملتا ہے جو کینجھر جھیل کے راستے شہر تک

پہنچتا ہے۔ لیکن اگر سیاست اور بیوروکریسی کے پردے ہٹا کر دیکھا جائے، تو یہ پورا نظام ایک سراب سے زیادہ کچھ نہیں۔ کراچی کے حصے والا سندھو دریا کا پانی راستے میں ہی غائب ہو جاتا ہے اورکراچی شہر کو عملاً صرف قدرت (بارش) کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا ہے۔

دریائے سندھ کا جغرافیہ اور سندھ میں آمد

دریائے سندھ (Indus River) صوبہ سندھ کی معاشی اور جغرافیائی لائف لائن ہے۔ یہ دریا پاکستان کے بالائی علاقوں سے ہوتا ہوا، پنجاب کی سرحد پار کر کے **کشمور اور اوباڑو** کے مقام سے صوبہ سندھ کی حدود میں داخل ہوتا ہے۔ سندھ میں اس کا پہلا استقبال **گدو بیراج** کرتا ہے۔ وہاں سے یہ دریا سندھ کے تقریباً 16 سے 18 اضلاع (بشمول سکھر، لاڑکانہ، دادو، نوابشاہ، حیدرآباد) کو سیراب کرتا ہوا جنوب کی طرف بڑھتا ہے اور آخر میں ضلع ٹھٹہ اور سجاول کے قریب **کیٹی بندر** کے مقام پر بحیرہ عرب میں گر کر ختم ہو جاتا ہے۔

سندھ میں داخلے کے وقت اس میں پانی کی مقدار مستقل نہیں رہتی:

- **گرمیوں اور مون سون (خریف) میں:** یہ آمد عام دنوں میں 1,50,000 سے 3,00,000 کیوسک اور سیلاب کے دنوں میں 8 سے 12 لاکھ کیوسک تک پہنچ جاتی ہے۔
- **سردیوں اور خشک سالی (ربیع) میں:** بالائی علاقوں میں پانی کی قدرتی قلت کے باعث یہ آمد خطرناک حد تک گر کر صرف **20,000 سے 25,000 کیوسک** رہ جاتی ہے، جس سے نیچے کے بیراج سوکھ جاتے ہیں.

ایک طرف جہاں کراچی گرمی ہو یا سردی بوند بوند پانی کو ترستا ہے، وہیں دوسری طرف مون سون کے سیزن میں دریائے سندھ کے راستے آنے والا لاکھوں کیوسک سیلابی پانی بغیر کسی ذخیرے کے مہینوں تک سمندر میں ضائع ہوتا رہتا ہے۔ کینجھر جیسی جھیلوں کی گنجائش مٹی بھرنے کی وجہ

سے آدھی رہ چکی ہے، اور سندھ حکومت نے سیلاب کے پانی کو روکنے کے لیے کوئی نئے ریزروائرز یا سمال ڈیمز نہیں بنائے کیونکہ کچے کی سندھ حکومت میں شامل وزرا کو دبئ میں پراپرٹیز بنانے سے فرصت ملے تب سندھ حکومت سندھ کے بارے میں کچھ سوچے ! نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جب قدرت پانی دیتی ہے تو ہمارے پاس برتن نہیں ہوتا، اور جب قدرت پانی روکتی ہے تو وڈیرے کراچی کا حق چوری کر لیتے ہیں اور یہ لطیفہ سننے کو ملتا ھے کہ" جب بارش ھوتا ھے تو پانی آتا ھے اور جب زیادہ بارش ھوتا ھے تو زیادہ پانی آتا ھے ـ" ورنہ ھم تو یہ سمجھ رہے تھے کہ بارش میں آسمان سے دودھ آتا ھے ۔

سندھ کی زراعت اور ماہی پروری کا بوجھ

دریائے سندھ صرف پینے کا پانی فراہم نہیں کرتا بلکہ یہ صوبے کےمعاشی ڈھانچے کا بوجھ بھی اٹھائے ہوئے ہے۔

- **زرعی اراضی:** سندھو دریا سندھ کی تقریباً **82 لاکھ ایکڑ قابلِ کاشت زمین** کو زندگی دیتا ہے، جہاں گندم، کپاس، چاول ، مکئ اور گنے کی زبردست فصلیں ، سبزیوں، کھجور ، کیلے و آموں کے وسیع باغات موجود ہیں۔ لاکھوں جانوروں کے لئے مختلف اقسام کا چارہ بھی وافر مقدار میں پایا جاتا ھے ۔
- **ماہی پروری (Fish Farming):** سندھ میں مچھلیوں کی پرورش کے لیے یہ دریا ریڑھ کی ہڈی ہے۔ صوبے میں تقریباً **1 لاکھ 21 ہزار ایکڑ** پر فش فارمز پھیلے ہوئے ہیں، جن کی تعداد **6,000 سے زائد** ہے، اور ان کا سب سے بڑا مرکز ٹھٹہ، بدین اور دادو کے اضلاع ہیں۔

کے بی فیڈر: صرف ایک نامیاتی نہر

دستاویزات کے مطابق کوٹری بیراج سے نکالی گئی **"کلری بگھار فیڈر" (KB Feeder)** وہ نہر ہے جو کینجھر جھیل کو دریائے سندھ کے پانی سے بھرتی ہے۔ لیکن زمینی حقیقت یہ ہے کہ کے بی فیڈر اب صرف ایک " نام" رہ گیا

ہے۔ سال کے بیشتر مہینوں میں، خصوصاً ربیع کے سیزن میں، یہ نہر ایک خشک سڑک یا مٹی کے ڈھیر کا منظر پیش کرتی ہے۔ صفائی نہ ہونے کی وجہ سے اس کے پیندے میں ریت جمع ہو چکی ہے اور پانی کا قدرتی بہاؤ ختم ہو چکا ہے۔

وڈیرہ شاہی، پانی کی چوری اور ہزاروں لفٹ پمپس

کے بی فیڈر کے خشک ہونے اور کینجھر جھیل تک پانی نہ پہنچنے کی سب سے بڑی وجہ کوئی قدرتی آفت نہیں، بلکہ **سندھ کی بااثر وڈیرہ شاہی** کی بے رحم پانی چوری ہے۔

ایک محتاط اندازے کے مطابق، گدو بیراج سے لے کر کوٹڑی اور کے بی فیڈر کے پورے روٹ پر **15,000 سے 20,000 غیر قانونی لفٹ پمپس اور پیٹر انجن** نصب ہیں۔ صرف کراچی کو پانی دینے والے روٹ پر 500 سے 800 کے قریب بڑے بڑے بھاری انڈسٹریل پمپس (8 انچ سے 24 انچ قطر والے) لگے ہوئے ہیں۔ بااثر سیاسی وڈیرے ان پمپس کے ذریعے کراچی کے پینے کا پانی چوری کر کے اپنے نجی فش فارموں اور گنے و کیلے کے باغات کو سیراب کرتے ہیں۔ محکمہ انہار اور مقامی انتظامیہ ان طاقتور چوروں کے سامنے مکمل طور پر بے بس ہے۔

پمپس کے ذریعے کراچی کے پانی کا قتلِ عام

سب سے بڑا اور دردناک سوال یہ ہے کہ ان غیر قانونی لفٹ پمپس کے ذریعے کراچی کا کتنا پانی چوری ہو رہا ہے؟ تکنیکی اعداد و شمار کے مطابق یہ چوری اتنے بڑے پیمانے پر ہے کہ شہر کا آدھا واٹر کرائسز صرف اسی چوری سے جڑا ہے:

- **گیلن کا نقصان:** کاغذات کے مطابق کراچی کو کینجھر جھیل کے نظام سے روزانہ تقریباً **650 ملین گیلن (MGD)** پانی ملنا چاہیے۔ لیکن یہ لفٹ پمپس روزانہ اس میں سے **150 سے 200 ملین گیلن (MGD) پانی چوری** کر لیتے ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ کراچی کے حق کا **تقریباً 25%**

سے **30% پانی** کینجھر جھیل پہنچنے سے پہلے ہی راستے میں غائب کر دیا جاتا ہے۔

- **کیوسک کا نقصان:** کراچی کو دریائے سندھ سے کل **1,200 کیوسک** پانی الاٹ ہے۔ وڈیروں کے بھاری انڈسٹریل پمپس سیکنڈوں میں نہر سے **300 سے 400 کیوسک** پانی مسلسل چوس رہے ہوتے ہیں۔ یہ چوری خاص طور پر مئی اور جون کے مہینوں میں عروج پر پہنچ جاتی ہے۔
- **کراچی پر اثر (ٹینکر مافیا کا راج):** جب پیچھے سے پانی چوری ہو جاتا ہے، تو کراچی کے سب سے بڑے پمپنگ اسٹیشن "دھابیجی" پر پانی کا لیول گر جاتا ہے۔ پمپس ائیر لاک ہو جاتے ہیں اور شہر کی سپلائی لائنیں سوکھ جاتی ہیں۔ اسی مصنوعی قلت کا فائدہ اٹھا کر شہر میں "ٹینکر مافیا" کا راج شروع ھوتا ہے، اور جو پانی شہریوں کو نلوں کے ذریعے سستا ملنا تھا، وہی پانی عوام ٹینکرز کے ذریعے ہزاروں روپے میں خریدنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

نیا انکشاف: کے-فور (K-IV) کا سب سے بڑا جھوٹ پانی کہاں ہے؟

کے فور منصوبے کا شور مچا کر کراچی پر احسان جتانے والے ایک سندھی ماھر آب سے گذشتہ سال ایک سیمینار کے آخر سوال و جواب کے سلسلے کے دوران میں نے ان ماھر آب سے پوچھا

" جب کینجھر جھیل پہلے ہی سوکھ رہی ہے، کے بی فیڈر خالی ہے، اور وڈیرے پچھلا پانی چوری کر رہے ہیں، تو کراچی کے سب سے بڑے زیرِ تعمیر منصوبے **کے-فور (K-IV)** کے لیے روزانہ مزید 650 ملین گیلن پانی کہاں سے آئے گا؟ تو وہ آئیں بائیں شائیں کرنے لگ گئے کہ جی ارسا ھمارا پانی چوری کر رھا ھے --- یہ وہ سوال ہے جہاں ماھرین آب اور سندھی بیوروکریسی کے ہاتھ پاؤں پھول جاتے ہیں۔

- **کاغذی اور سیاسی دلاسے:** وفاقی ادارے ارسا (IRSA) نے کاغذوں پر تو کراچی کے لیے دریائے سندھ سے 1200 کیوسک کا کوٹہ منظور کر رکھا ہے۔ روٹ کو بھی کینجھر سے بدل کر کالی ملوک اور جھمپیر کے

متبادل کینال سسٹم سے جوڑا جا رہا ہے، لیکن یہ سب صرف "پائپ لائنوں کا روٹ" ہے، "پانی" نہیں ہے۔

- **پانی کا نہ ہونا اور صوبائی جنگ:** اصل سچ یہ ہے کہ **دریائے سندھ میں کے-فور کو دینے کے لیے ایک بوند بھی اضافی پانی موجود نہیں ہے۔**
جب کشمور کی سرحد پر نیا پانی آ ہی نہیں رہا اور سندھ میں سیلابی پانی کو جمع کرنے کا نظام ھی نہی ھے ، تو اول مرحلے پر کے فور فلاپ ھی ھونا ھے کیونکہ پانی ھے ھی نہی اور زبردستی کے-فور کو چلانے کا مطلب یہ ہوگا کہ ٹھٹہ، بدین اور سجاول کے غریب کسانوں کا زرعی پانی کاٹ کر اس پائپ لائن میں ڈالا جائے گا۔ یہ ایک ایسا انتظامی المیہ ہے جو سندھ کے کسانوں اور کراچی کے شہریوں کو آپس میں لڑانے کا سبب بن رہا ہے۔
- **نئی نہر، نئے چور:** اگر اربوں روپے لگا کر کے-فور کے اوپن کینال اور پائپ لائنیں بنا بھی دی گئیں، تو وہ بھی سندھ کے انہی اضلاع سے گزریں گی جہاں وڈیرہ شاہی قائم ہے۔ جب پرانی نہروں پر لگے 20 ہزار پمپس نہیں ہٹائے جا سکے، تو کے-فور کے روٹ کو ان چوروں سے بچانا ناممکن ہوگا۔

اصل حقیقت: کراچی صرف بارش کے پانی پر زندہ ہے

جب دریا کا پانی وڈیرے ہضم کر جاتے ہیں، کے بی فیڈر خالی ہو جاتی ہے اور کے-فور کے لیے پانی موجود ہی نہیں، تو کینجھر جھیل کیسے بھرتی ہے؟ یہاں سامنے آتی ہے وہ سب سے بڑی حقیقت جسے سرکاری طور پر چھپایا جاتا ہے: **کراچی کے حصے میں عملاً صرف بارش کا پانی آتا ہے۔**
کینجھر جھیل کے ارد گرد "کوہستان" کا پتھریلا اور پہاڑی سلسلہ ہے۔ جب بھی اس خطے میں برسات ہوتی ہے، تو پہاڑوں سے نکلنے والے درجنوں قدرتی ندی نالے (جیسے کلو کھبر اور ہدیارو) لاکھوں گیلن بارشی پانی لے کر کینجھر جھیل میں گرتے ہیں۔ یہ بارش کا پانی ہی ہے جو جھیل کے لیول کو برقرار رکھتا ہے اور کراچی کی چند گھونٹ کی پیاس بجھاتا ہے۔ جس سال

بارشیں اچھی ہوں، کراچی کو کچھ پانی مل جاتا ہے، لیکن جس سال برسات نہ ہو، کراچی بوند بوند کو ترس جاتا ہے کیونکہ دریا کے پانی پر وڈیروں کا قبضہ ہوتا ہے۔

حاصلِ کلام اور حل

کراچی کا واٹر کرائسز پانی کی "قدرتی کمی" کا نہیں، بلکہ **سیاسی گٹھ جوڑ، وڈیرہ شاہی کی دادا گیری اور انتظامی نااہلی** کا نتیجہ ہے۔ کے-فور جیسے میگا پراجیکٹس اس وقت تک لوہے کے بے جان پائپ رہیں گے جب تک دریا کو چوروں سے آزاد نہیں کرایا جاتا۔

مستقل حل کے لیے روایتی بیانات سے ہٹ کر ہنگامی اقدامات ناگزیر ہیں۔

کہا جاتا ھے کہ رینجرز اور قانون نافذ کرنے والے اداروں کے ذریعے مہم چلا کر کے بی فیڈر اور کوٹری روٹ پر لگے تمام وڈیروں کے غیر قانونی لفٹ پمپس کو فوری طور پر مسمار اور ضبط کیا جائے لیکن کیا یہ کام امریکن سینٹرل کمانڈ سینٹکام آکر کرے گی ؟

کے بی فیڈر کی مکمل بھل صفائی کی جائے اور اسے پکا (Re-lining) کیا جائے تاکہ پانی کا زیاں روکا جا سکے لیکن اس کام کے لئے کافی پیسے چاہیئں اور سندھ کو ملنے والا پیسہ تو دبئ کی شان بڑھانے میں لگ جاتا ھے ۔

دریائے سندھ اور وڈیروں کے رحم و کرم پر انحصار کم کرنے کے لیے کراچی کے ساحل پر **سمندری پانی کو میٹھا کرنے والے (Desalination) پلانٹس** لگائے جائیں، جو دنیا بھر کے ساحلی شہروں کا مستقل حل ہے لیکن اس کام میں 100 ارب روپے لگا دیئے تو دبئ والے ناراض ھو جائیں کہ سندھی حکومت دبئ کی بجائے کراچی پر پیسہ لگا رہی ھے !

کے-فور بمقابلہ ڈی سیلینیشن

اگر حکومت کے-فور (K-IV) جیسے منصوبوں پر، جن کے لیے دریا میں پانی ہی موجود نہیں ہے، 100 ارب روپے سے زائد خرچ کر رہی ہے، تو اس کے مقابلے میں **50 ارب روپے میں 100 MGD کا ڈی سیلینیشن پلانٹ** کراچی کے ساحل پر لگایا جا سکتا ہے۔ وڈیروں کا غلام فاترالعقل کوئ سندھی یہ کہانی نہ سنائے کہ ڈی سیلینیشن پراسس پر خرچہ آتا ھے تو گدھو پرشاد جی کراچی کے پیسوں میں سے دس بیس ارب کا خرچہ ھو جائے گا تو کون سی آفت آن پڑے گی۔ یہ پیسے ھم بلاول کی چڈی نیلام کر کے تھوڑا جمع کریں گے ۔

اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ کراچی کو وڈیروں کی پانی چوری اور کے بی فیڈر کے سوکھنے کے عذاب سے ہمیشہ کے لیے نجات مل جائے گی اور شہر کو اپنے ہی ساحل سے مستقل پانی ملتا رہے گا ۔

اگر اس لائف لائن کو چوروں اور مٹی کے ڈھیر سے نجات نہ دلائی گئی، تو ساڑھے تین کروڑ سے زائد آبادی والا یہ معاشی انجن ہمیشہ بادلوں کی طرف دیکھنے پر مجبور رہے گا اور یہ بحران کسی بڑے انسانی المیے میں تبدیل ہو جائے گا۔

معیشت کا جنازہ: صوبائی لوٹ سیل، وفاق کی نامردی اور اشرافیہ کا "نو بیئر" فارمولا

ابو حیان سعید

پاکستانی معیشت اس وقت کسی ہسپتال کے آئی سی یو (ICU) میں نہیں، بلکہ ایک ایسے مذبح خانے میں پڑی ہے جہاں بیرونی دنیا اسے مصنوعی آکسیجن دے کر زندہ رکھنے کی کوشش کر رہی ہے، جبکہ اندر بیٹھی حکمران اشرافیہ اور مافیا اس کے جسم سے گوشت کا آخری لوتھڑا تک نوچنے کے لیے صف آرا ہیں۔ اعداد و شمار گواہ ہیں کہ یہ ملک معاشی طور پر مر چکا ہے، بس اس کے دفنانے کا اعلان باقی ہے۔

ہمارے پاس ڈالرز لانے کے صرف دو راستے بچے ہیں:

پہلا راستہ: بیرون ملک مقیم پاکستانیوں کی خون پسینے کی کمائی (Remittances) جو مالی سال 2025 میں 38.3 ارب ڈالرز کی ریکارڈ سطح پر پہنچی۔ یہ وہ پیسہ ہے جو دیارِ غیر میں ذلیل و خوار ہونے والے پاکستانی اپنی ماؤں بہنوں کے لیے بھیجتے ہیں، لیکن یہاں بیٹھے لٹیرے اسے عیاشیوں کی نذر کر دیتے ہیں۔

دوسرا راستہ: ہماری ہچکیاں لیتی ہوئی برآمدات (Exports) جو بمشکل 30 سے 31 ارب ڈالرز کے درمیان قید ہیں۔ مالی سال 2026 کے پہلے گیارہ مہینوں میں محض 27.9 ارب ڈالرز کی برآمدات یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں کہ ملک میں صنعت و حرفت کا گلا گھونٹ دیا گیا ہے۔

ایف بی آر (FBR): عوام کی گردن پر جلاد کا کلہاڑا

مقامی سطح پر حکومت چلانے کے لیے ٹیکس کا نظام نہیں، بلکہ بھتہ خوری کا ایک سرکاری نیٹ ورک (FBR) قائم ہے۔ اس کلہاڑے نے عوام کی گردن کاٹ کر مالی سال 2025 میں 11,737 ارب روپے (42.2 ارب ڈالرز) نچوڑے، اور جاری مالی سال 2026 میں اس جابرانہ وصولی کا ہدف 14,131 ارب روپے (50.8 ارب ڈالرز) مقرر کیا گیا ہے۔ یہ معیشت کی ترقی کا پیسہ نہیں ہے، یہ وہ خون ہے

جو پیٹرولیم لیوی، جنرل سیلز ٹیکس (GST)، اور ظالمانہ سرچارجز کی شکل میں غریب اور متوسط طبقے کی جیب سے بندوق کی نوک پر نکالا جا رہا ہے۔
این ایف سی (NFC) ایوارڈ: ورٹیکل امبیلنس یا ملکی بقا کا سودا؟

اصل معاشی خودکشی کا آغاز تب ہوتا ہے جب اس نچوڑی ہوئی کمائی کی تقسیم کا ڈھانچہ دیکھا جائے۔ این ایف سی (NFC) ایوارڈ کے نام پر ایک ایسا "ورٹیکل امبیلنس" تخلیق کیا گیا ہے جو وفاق کو اپاہج اور صوبوں کو شترِ بے مہار بنا دیتا ہے۔
ایف بی آر جتنا ٹیکس روپوں کی شکل میں جمع کرتا ہے، اس کا **57.5 فیصد** حصہ سیدھا صوبوں کی جھولی میں گر جاتا ہے جو ڈالرز میں تبدیل کیا جائے تو تقریباً 26.7 ارب ڈالرز بنتا ہے۔ اس ریوڑی کا سب سے بڑا حصہ پنجاب اور سندھ جیسے بڑے صوبے اڑا لے جاتے ہیں:

- **پنجاب کا حصہ:** 13.4 ارب ڈالرز (3,726 ارب روپے)
- **سندھ کا حصہ:** 6.5 ارب ڈالرز (1,826 ارب روپے)

ان دو بڑے صوبوں کا مجموعی حصہ ہی تقریباً 20 ارب ڈالرز بن جاتا ہے، جبکہ خیبر پختونخوا 4.4 ارب ڈالرز اور بلوچستان 2.3 ارب ڈالرز پر ٹخا دیے جاتے ہیں۔

وفاق کا دیوالیہ پن اور شاہانہ عیاشیاں

صوبے وفاق کا سینہ چاک کر کے یہ بڑی بڑی بوٹیاں تو نوچ لیتے ہیں، لیکن جب ملک چلانے کی باری اتی ہے تو وفاق کے پاس اپنے کل ہدف میں سے صرف 23.3 ارب ڈالرز بچتے ہیں۔ اب ذرا اس معاشی جرم کا موازنہ کیجیے: وفاق کے سر پر صرف پرانے قرضوں کے سود اور قسطوں کی ادائیگی کا سالانہ بوجھ ہی **35 ارب ڈالرز ہے!**
اس کے باوجود، وفاق کے اپنے اللے تللے اور شاہانہ عیاشیاں ختم ہونے کا نام نہیں لے رہیں۔ بیوروکریسی کی بھاری بھرکم فوج، وزیروں اور مشیروں کی فوجِ ظفر

موج، اور لا متناہی مراعات کا ایک ایسا سمندر ہے جو سوکھنے میں نہیں آرہا۔ ایک ایک افسر اور وزیر کے لیے چار چار جدید گاڑیاں، اربوں روپے کا مفت پیٹرول، مفت گیس اور مفت بجلی فراہم کی جا رہی ہے۔ اخلاقی دیوالیہ پن کا یہ عالم ہے کہ ایک خصوصی معاون نے تیرہ لاکھ روپے کا بینکاک میں مساج کرانے کا بل بھی اپنی وزارت سے طلب کر لیا! یعنی ننگا ناچ جاری ہے اور حکومتی اراکین کی بدکاریاں اور ان کی لونڈیاں پالنے کا بل بھی اس ملک کا غریب عوام چکانے پر مجبور ہے۔ وفاقی حکومتی لشکر کے درجنوں عمروں اور حج کے اخراجات بھی سرکار کے خزانے سے ادا کیے جاتے ہیں۔
وفاق صوبوں کو مالامال کرنے اور اپنی عیاشیاں پوری کرنے کے بعد کوڑی کوڑی کو محتاج ہو جاتا ہے۔ دفاع، ترقیاتی کاموں، تعلیم اور صحت کے لیے وفاق کے پاس دھیلا نہیں بچتا۔ اس خسارے کو پورا کرنے کے لیے وفاق دوبارہ آئی ایم ایف (IMF)، چین اور سعودی عرب کے سامنے گھٹنوں کے بل جھکتا ہے، نئے کمرشل قرضے لیتا ہے اور ان قرضوں کو چکانے کے لیے عوام پر مزید ٹیکسوں کا بوجھ لاد دیا جاتا ہے۔ صوبے عیاشیاں کرتے ہیں اور وفاق دیوالیہ پن کی دلدل میں دھنستا چلا جاتا ہے۔

یورپ کا لطیفہ اور پاکستان کی تلخ حقیقت
یہ پورا منظرنامہ یورپ کے اس مشہور لطیفے کی ہو بہو عکاسی کرتا ہے جہاں ایک جرمن شہری بار میں جا کر 3 یورو کی بیئر مانگتا ہے، لیکن بار ٹینڈر یوکرین کی مدد، روس پر پابندیوں، برطانوی معیشت کو سنبھالنے اور گیس کی سبسڈی کے نام پر مختلف ٹیکس اور سرچارجز ملا کر اس سے 20 یورو وصول کر لیتا ہے۔ گاہک خاموشی سے 20 یورو دے دیتا ہے، لیکن بار ٹینڈر اسے 3 یورو واپس کرتے ہوئے کہتا ہے کہ "جناب، یہ آپ کے بیئر کے پیسے واپس، کیونکہ ہمارے پاس بیئر تو ہے ہی نہیں!"

پاکستان کی معاشی حالت بھی بالکل یہی ہے۔ یہاں کا عام شہری، رکشے والا، تنخواہ دار طبقہ اور کسان خاموشی سے پیٹرول، بجلی اور آٹے پر ٹیکسوں کی شکل میں بھاری رقم ادا کر رہا ہے۔ اسے بتایا جاتا ہے کہ یہ پیسہ ملک کو قرضوں سے نجات

دلائے گا، صوبوں کی ترقی پر لگے گا، انفراسٹرکچر بنائے گا۔ لیکن جب وہ معاشی ریلیف، سستی بجلی، سستا راشن اور بنیادی حقوق کی "بیئر" مانگتا ہے، تو ریاست مسکرا کر کہتی ہے کہ "ٹیکس اور سرچارجز کا شکریہ، لیکن ہمارے پاس معیشت نام کی کوئی چیز موجود ہی نہیں ہے!"
یہ کوئی معاشی ماڈل نہیں، بلکہ ایک منظم، دانستہ اور مجرمانہ **معاشی خودکشی** ہے، جہاں پیداواری صلاحیت صفر ہے، صوبے وفاق کو نچوڑ رہے ہیں، اور وفاق عوام کی چمڑی ادھیڑ کر ایک ایسی سراب کے پیسے وصول کر رہا ہے جو سرے سے وجود ہی نہیں رکھتی۔

کیا پاکستان ایک ناکام ریاست ہے؟ یا ایک کامیاب مافیا؟
ایک عام تاجر اور صنعتکار سے یہ ریاست کیا توقع رکھتی ہے؟ وہ ٹیکس بھی دے، طرح طرح کی بھتہ خور مافیاؤں اور سرکاری اداروں کو بھاری رشوتیں بھی دے، حکمرانوں کی فیملیز کو بے تحاشہ شاپنگ بھی کروائے، ان کے عمروں اور بیرون ملک دوروں کے اخراجات بھی اسپانسر کرے، پورا پورا ٹیکس بھی دے اور اپنے ہی کاروبار کو جلتے ہوئے دیکھ کر اف تک نہ کرے۔
جب انکم ٹیکس آفیسرز کے بچے صنعتکاروں کے پیسوں پر دبئی، یورپ اور امریکہ کے تفریحی دوروں پر جائیں گے اور ان کی برتھ ڈے پارٹیز بحرالکاہل کے جزیروں پر ہوا کریں گی، تو وہ صنعتکاروں کو ملکی ترقی کا راستہ نہیں، بلکہ ٹیکس چوری کرنے کے سو سو طریقے بتائیں گے۔ جب انکم ٹیکس افسروں کے لیے کینیڈا، آسٹریلیا اور یورپ کی شہریت لینے کے لیے کروڑوں روپے کی بینک گارنٹیز یہی صنعتکار دیں گے، تو ان سے ٹیکس وصول کرنے کی جرات کس مائی کے لعل میں ہوگی؟
موجودہ اعلی ترین آئینی عہدے پر فائز زرداری کی خاص پنٹر اور **منی لانڈرنگ کوئین ایان علی** کو پکڑنے والے امیگریشن آفیسر کو دن دہاڑے قتل کر دیا جاتا ہے اور ریاست قاتلوں کو پکڑنے کے بجائے تماشہ دیکھتی ہے۔ ایسے خوف کے ماحول میں کروڑوں ڈالر ماہانہ کی منی لانڈرنگ کون روک سکتا ہے؟
لوٹ مار کی تاریخی داستانیں اور ریاستی دہشت گردی

فروری 1997 کا ڈاکا: "قرض اتارو ملک سنوارو" کے نام نہاد سلوگن تلے شریف خاندان عوام اور تاجروں کے اربوں روپے ہڑپ کر گیا۔ پورے ملک کے تاجروں اور انڈسٹریلسٹس کو بدمعاشی کے زور پر پیغام دیا گیا تھا کہ اس فنڈ میں لازمی حصہ لیں ورنہ میاں صاحب کے عتاب کے لیے تیار رہیں۔

سندھ حکومت کا "سسٹم": ریاستی سرپرستی میں قائم کراچی میں سندھ حکومت کے "سسٹم" نامی مافیا کو بھتہ کی ادائیگی میں ذرا سی تاخیر ہو جائے تو ملینئم مال اور گل پلازہ کو کیمیکل ڈال کر آگ لگا دی جاتی ہے۔ سینکڑوں انسانوں کو زندہ جلا کر راکھ کر دیا جاتا ہے اور قانون نافذ کرنے والے ادارے تماشائی بنے رہتے ہیں۔

بلدیہ ٹاؤن کا المیہ: اس سے قبل ریاستی سرپرستی میں ڈرلنگ مشین اور سیکٹر انچارجز کا سسٹم برسوں راج کرتا رہا ہے، جس نے بلدیہ ٹاؤن کی فیکٹری میں کیمیکل چھڑک کر انسانوں کو زندہ جلانے کا وحشیانہ تجربہ کیا، جس کے نتیجے میں 287 معصوم افراد جل کر کوئلہ بن گئے۔ سندھ حکومت کے موجودہ "سسٹم" نے یہ دہشت گردانہ ٹیکنالوجی وہیں سے کاپی کی ہے۔

جب تاجروں کو وزیروں کی عورتوں کے دبئی، بینکاک اور یورپ کے ریٹرن ٹکٹس اور تفریحی اخراجات پورے کرنے کے بعد بھی سیکیورٹی نہ ملے اور آگ کا سامنا کرنا پڑے، تو وہ اپنا کاروبار سمیٹ کر بنگلہ دیش، سری لنکا اور کمبوڈیا ہی ہجرت کریں گے۔ حد تو یہ ہے کہ اگر ان کی فرمائشیں پوری نہ کی جائیں تو بلیک میلنگ پر اتر کر دھمکیاں دی جاتی ہیں کہ: ”تمہارا بیٹا فلاں کالج میں پڑھتا ہے، بیٹی فلاں یونیورسٹی میں پڑھتی ہے، آج اس نے فلاں رنگ کے کپڑے پہنے ہیں اور اس کے پاس فلاں رنگ کا بیگ ہے... وہ فلاں وقت آتے جاتے ہیں...“ یہ کسی ریاست کے کارندوں کا لہجہ نہیں، بلکہ اغوا کاروں اور وحشی غنڈوں کا اسلوب ہے۔

ملک ریاض: اشرافیہ کا سب سے بڑا فنانسر

ملک ریاض جیسے کرداروں کو دیکھیے، جس نے تمام عمر جرنیلوں اور افسر شاہی کو ہزاروں ارب روپے کے پلاٹ مفت بانٹے، جرنیلوں کی بیگمات کو ہیروں کے سیٹ دیے، ہر سال نئے ماڈل کی مہنگی ترین گاڑیاں نیو ایئر گفٹ کے طور پر پیش کیں، ان کے بچوں کو غیر ملکی دورے اور اربوں روپے کی شاپنگ کرائی،

غیر ملکی یونیورسٹیوں میں داخلے دلوا کر ان کی بھاری فیسیں ادا کیں، اور کنگلے و توتلے صحافیوں کو حج و عمرے کروا کر، پلاٹ اور اشتہارات دے کر پالتو بنا کر رکھا۔ اس سب کے باوجود وہ ٹیکس بھی دیتا رہا، لیکن آج وہ بھی جلا وطن ہے۔ جب مافیا کے اپنے مہرے محفوظ نہیں، تو عام تاجر کی کیا اوقات؟

حتمی فرمان: یہ ریاست نہیں، ایک منظم مافیا ہے

آج پاکستان کے تاجروں، صنعتکاروں اور عام شہریوں کے لیے ریاست کا صرف ایک ہی برہنہ اور ظالمانہ فرمان ہے:

1. **ٹیکس بھی دو۔**
2. **بھتہ بھی دو۔**
3. **چندے بھی دو۔**
4. **حکمرانوں کے سفری اخراجات بھی اٹھاؤ۔**
5. **ان کی تمام ناجائز اور عیاشانہ فرمائشیں پوری کرو۔**
6. **اور اگر نہ دو... تو اپنی جان، مال اور بچوں کی تباہی کا منظر دیکھنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔**

یہ کوئی ریاست نہیں ہے، یہ ایک وحشی مافیا کا طریقہ کار ہے اور بدقسمتی کی انتہا یہ ہے کہ یہ سب کچھ ریاستی چھتری تلے، قانون کے محافظوں کی نگرانی میں ہو رہا ہے۔

ریاست اب صرف کاغذ کے ٹکڑوں اور سرکاری دستاویزات پر زندہ ہے، شہریوں کے ذہن اور دل میں یہ ریاست کب کی مر چکی ہے۔ اور تاریخ گواہ ہے کہ جب کوئی ریاست اپنے شہریوں کے دل سے نکل جائے، تو اسے طاقت کے زور پر، گولی کے دم پر یا جھوٹے بیانیوں سے واپس لانا ناممکن ہوتا ہے۔

راحت اندوری نے شاید اسی فرعونیت اور اس کے انجام کے لیے فرمایا تھا:

لگے گی آگ تو آئیں گے گھر کئی زد میں
یہاں پہ صرف ہمارا مکان تھوڑی ہے

بارود کا جنون اور کائناتی بے حسی:

انسانیت کس مقتل کی طرف بڑھ رہی ہے؟

ابو حیان سعید

اکیسویں صدی کا انسان جہاں خود کو شعور کی معراج پر دیکھتا ہے، وہیں اس کی عملی ترجیحات تاریخ کے ہولناک ترین تضاد کو جنم دے رہی ہیں۔ سٹاک ہوم انٹرنیشنل پیس ریسرچ انسٹی ٹیوٹ (SIPRI) کے حالیہ ترین اعدادوشمار کے مطابق، عالمی ملٹری بجٹ **2.9 ٹریلین ڈالر** کی تاریخی سطح کو چھو رہا ہے۔ یہ خطیر رقم اس تلخ حقیقت کا ثبوت ہے کہ کائنات کی یہ واحد "ذی شعور" مخلوق تعمیر کے بجائے تخریب کے جنون میں مبتلا ہے۔ ہزاروں کھرب ڈالر کا اسلحہ بنا کر اور کروڑوں انسانوں کو جنگ کی بھٹی میں جھونک کر بھی انسان کی خونی پیاس نہیں بجھ رہی، اور اب یہ بے حسی زمین کی حدود سے نکل کر مریخ اور دیگر سیاروں کو خراب کرنے کی تیاری کر رہی ہے۔

1. ملٹری بجٹ اور وسائل کا مجرمانہ ضیاع

دنیا کے کل فوجی اخراجات کا تقریباً **58 فیصد** حصہ صرف پانچ بڑے ممالک (امریکہ، چین، روس، جرمنی اور بھارت) خرچ کر رہے ہیں۔ یہ سرمایہ کاری انسانی بقا کی تین بنیادی ضرورتوں یعنی **خوراک، تعلیم اور صحت** کا گلا گھونٹ کر کی جا رہی ہے۔ اگر اس بجٹ کا محض **50 فیصد** حصہ بھی فوری طور پر فلاحِ عامہ پر منتقل کر دیا جائے، تو دنیا کا نقشہ یوں بدل سکتا ہے:

غذائی بحران کا خاتمہ: دنیا سے بھوک کے مستقل خاتمے کے لیے سالانہ صرف 40 سے 50 ارب ڈالر درکار ہیں۔ بم بنانے والا سرمایہ اگر جدید زراعت اور ویسٹ ٹو فرٹلائزر (Waste-to-Fertilizer) جیسے پائیدار ماڈلز پر لگایا جائے، تو دنیا کا کوئی بچہ بھوکا نہیں سوئے گا۔

شعور اور تعلیم کی روشنی: بارود نفرت پھیلاتا ہے جبکہ تعلیم امن کو جنم دیتی ہے۔ اگر جنگی سرمایہ یونیوسٹیوں اور ریسرچ سینٹرز پر لگایا جائے، تو نوجوان نسل تباہی کے ہتھیار بنانے کے بجائے مفکر اور مصلح بنے گی۔
صحت عامہ کی ضمانت: دنیا کو مہلک میزائلوں کی نہیں، بلکہ کینسر جیسی بیماریوں کے سستے علاج اور مفت بنیادی صحت کی ضرورت ہے۔ جب جنگی جنون کی وجہ سے صحت کا بجٹ کاٹا جاتا ہے، تو ہسپتالوں کے بجائے فوجی بیرکیں آباد ہوتی ہیں۔

2. ترقی پذیر ممالک پر جیو پولیٹیکل دباؤ
اس عالمی جنگی جنون کا سب سے بڑا المیہ ترقی پذیر اور غریب ممالک کو بھگتنا پڑتا ہے۔ مثال کے طور پر، جنوب مشرقی ایشیا میں جب بھارت کا دفاعی بجٹ **92 ارب ڈالر** سے تجاوز کرتا ہے، تو پاکستان جیسے ممالک کو اپنی جغرافیائی مجبوریوں اور سیکیورٹی چیلنجز کی وجہ سے، محدود وسائل کے باوجود، اپنے دفاع کو مضبوط رکھنا پڑتا ہے۔
اس کا براہِ راست اثر ملکی معیشت پر پڑتا ہے۔ وہ پیسہ جو کراچی جیسے بڑے شہروں کے پانی کے بحران (Water Crisis)، پبلک ٹرانسپورٹ، اور دیہی علاقوں میں صحت و تعلیم پر لگنا چاہیے، وہ خطے کے توازن کو برقرار رکھنے کے لیے جدید ترین دفاعی ٹیکنالوجی، ڈرونز اور سائبر سیکیورٹی پر خرچ کرنا پڑتا ہے۔

3. اپنے حسین سیارے سے غداری اور مریخ کی دوڑ
انسان کی بے حسی کی انتہا یہ ہے کہ وہ ایک طرف اپنے خوبصورت، زندہ اور سرسبز سیارے (زمین) کو کارپوریٹ لالچ، آلودگی اور ایٹمی بارود سے تباہ کر رہا ہے، اور دوسری طرف مریخ (Mars) جیسے مردہ سیاروں پر بستی بسانے کے نام پر اربوں ڈالر برباد کر رہا ہے۔
مریخ پر نہ پینے کا پانی ہے، نہ سانس لینے کو آکسیجن، اور نہ ہی سورج کی مہلک شعاعوں سے بچانے والا مقناطیسی میدان۔ اس مردہ لال مٹی کو رہنے

کے قابل بنانے (Terraforming) کے لیے انسان کھربوں ڈالر جھونکنے کو تیار ہے، لیکن جو جنت (زمین) قدرت نے اسے مفت میں بسا کر دی تھی، اس کے سمندروں کو پلاسٹک سے بھر رہا ہے اور اس کی فضا کو زہریلا کر رہا ہے۔ اگر انسان اپنی بے حسی اور لالچ کی عادت نہیں بدلتا، تو وہ مریخ پر جا کر بھی وہاں کوئی نئی جنت نہیں بنائے گا، بلکہ اپنے ساتھ وہاں بھی جنگ، آلودگی اور تباہی کا نظام ہی لے کر جائے گا۔

4. موت کا کاروبار اور "ملٹری-انڈسٹریل کمپلیکس"

انسان کی یہ خونی پیاس خود بخود نہیں بڑھ رہی، بلکہ اس کے پیچھے ایک منظم سرمایہ دارانہ نظام چھپا ہوا ہے۔ دنیا کے بڑے ممالک میں ہتھیار بنانے والی کمپنیاں (Military-Industrial Complex) اربوں ڈالر کا منافع کماتی ہیں۔ ان کا کاروبار تب ہی چلتا ہے جب دنیا میں کہیں نہ کہیں معصوم انسانوں کا خون بہتا رہے اور جنگ کا ماحول گرم رہے۔ یہ مافیا حکومتوں کی پالیسیوں پر اثر انداز ہو کر دفاعی بجٹوں میں اضافہ کرواتا ہے۔ عالمی جیو پولیٹکس میں ایک ایسا خوف کا ماحول پیدا کر دیا گیا ہے جہاں کوئی بھی ملک پہلے اپنے ہتھیار کم کرنے کو تیار نہیں ہوتا، اور یوں یہ اندھی دوڑ جاری رہتی ہے۔

5. بے لگام ایجادات اور AI: سیکنڈوں میں راکھ کا ڈھیر بنتی دنیا

جدید سائنس نے انسان کو جہاں سہولیات دیں، وہاں ایسے مہلک ہتھیار بھی تھما دیے ہیں جو اب انسانی کنٹرول سے باہر ہو رہے ہیں۔ ماضی کی جنگوں میں بٹن دبانے یا فیصلہ کرنے کے لیے انسان موجود ہوتا تھا، لیکن آج دنیا **"مہلک خودکار ہتھیاروں" (Lethal Autonomous Weapons)** کی طرف منتقل ہو چکی ہے۔ اس کا سب سے ہولناک پہلو آرٹیفیشل انٹیلیجنس (AI) کا جنگی نظام میں انضمام ہے۔

آج دنیا کی سپر پاورز نے اپنے ایٹمی میزائلوں اور دفاعی نظاموں کو AI کے الگورتھم سے منسلک کر دیا ہے تاکہ دشمن کے حملے کا جواب سیکنڈوں میں دیا جا سکے۔ لیکن سائنسی حقیقت یہ ہے کہ کوئی بھی سافٹ ویئر یا AI

الگورتھم 100 فیصد غلطی سے پاک نہیں ہوتا۔ اگر کسی الگورتھم میں ایک معمولی سا "بگ" (Bug) یا کوڈنگ کی بال برابر غلطی آ جائے، یا وہ پرندوں کے کسی جھنڈ یا کسی موسمیاتی تبدیلی کو دشمن کا ہائپرسونک میزائل سمجھ بیٹھے، تو وہ انسان سے پوچھے بغیر خودکار طریقے سے جوابی ایٹمی حملے کا حکم جاری کر سکتا ہے۔ انسان کو سنبھلنے، سوچنے یا اپنی غلطی سدھارنے کے لیے ایک سیکنڈ بھی نہیں ملے گا اور پوری دنیا پلک جھپکتے میں راکھ کا ڈھیر بن جائے گی۔

6. سائنسی ایجادات کو "جنونی سائنسدانوں" سے بچانے کی ضرورت
اس مقتل سے بچنے کے لیے سب سے بڑا چیلنج یہ ہے کہ سائنسی ایجادات کو ان **"جنونی سائنسدانوں" (Mad Scientists)** سے کیسے بچایا جائے جو اخلاقیات سے عاری ہو کر صرف کارپوریٹ فنڈنگ اور جنگی طاقت کے لیے کام کر رہے ہیں۔ سائنس بذاتِ خود بری نہیں ہے، لیکن جب یہ کسی ایسے دماغ کے ہاتھ چڑھ جائے جو انسانی ہمدردی سے خالی ہو، تو یہ کائنات کی سب سے خطرناک ترین چیز بن جاتی ہے۔ اس کے لیے درج ذیل فوری اقدامات کی ضرورت ہے:
سائنسی اخلاقیات کا عالمی چارٹر (Global Ethical Charter): جیسے ماضی میں بائیولوجیکل ہتھیاروں پر پابندی کے معاہدے ہوئے، اسی طرح اب ایک سخت عالمی قانون کی ضرورت ہے جس کے تحت کسی بھی سائنسدان یا کارپوریشن کو ایسا AI الگورتھم یا جینیاتی ہتھیار (Biological Weapon) بنانے کی اجازت نہ ہو جو انسانی نسل کو مٹا سکے۔
تحقیق کی سویلین مانیٹرنگ: سائنسدانوں کی تحقیق لیبارٹریوں کے خفیہ تہ خانوں تک محدود نہیں ہونی چاہیے۔ بین الاقوامی فلاسفرز، قانون دانوں اور امن پسند ماہرین کی کمیٹیاں ہونی چاہئیں جو یہ کڑی نگرانی کریں کہ کوئی بھی نئی ایجاد انسانی فلاح کے لیے استعمال ہو رہی ہے یا تباہی کے لیے۔
جنگی فنڈنگ پر پابندی: سائنسدانوں کو بڑے فنڈز اور مراعات ملٹری بجٹ سے ملتی ہیں۔ اگر عالمی سطح پر دفاعی فنڈنگ کو روک کر ان سائنسدانوں کو

زراعت، کینسر کی ریسرچ، اور ماحولیاتی تبدیلیوں پر تحقیق کے لیے فنڈز دیے جائیں، تو ان کی ذہانت کا رخ تخریب سے ہٹ کر تعمیر کی طرف موڑ دیا جائے گا۔

حاصلِ کلام :

زمین اتنی وسیع اور وسائل سے مالامال ہے کہ یہ آنے والے کئ ہزار سالوں میں 100 ارب انسانوں کی خوراک، چھت، تعلیم اور صحت کی ضرورت کو باآسانی پورا کر سکتی ہے، لیکن یہ چند جنگی جنونیوں، سرمایہ داروں اور اخلاقیات سے عاری سائنسدانوں کے لالچ کو پورا نہیں کر سکتی۔ انسان اس زمین پر ایک ایسے "کائناتی وائرس" کی طرح برتاؤ کر رہا ہے جو اپنے ہی میزبان (Host) کو کھا کر ختم کر دیتا ہے۔

آج کا انسان اس خطرناک وہم میں مبتلا ہے کہ وہ مریخ پر بستی بسا لے گا، لیکن سچ یہ ہے کہ اگر اس نے AI اور بارود کے اس مہلک شیطانی ملاپ پر قابو نہ پایا، تو مریخ جانے سے پہلے ہی زمین پر انسان کا اپنا وجود ایک ھی عشرے میں بھیانک تاریخ بننے جا رھا ھے ۔اگر انسانیت کو بچانا ہے تو ہتھیاروں کی تجارت اور جنگی الگورتھم پر فوری عالمی پابندی لگانا ہوگی۔ بارود کا دھواں صرف موت لاتا ہے، جبکہ امن، خوراک، تعلیم اور صحت ہی زندگی کی اصل نوید ہیں۔

صوبائی خود مختاری کا ڈرامہ: آئینی سراب اور صوبوں کی بلیک میلنگ

ابو حیان سعید

سننے اور پڑھنے میں کتنا دلفریب، سحر انگیز اور پر اثر ہے یہ تین الفاظ پر مشتمل ٹرائیکا **" صوبائی خود مختاری"**۔ کون احمق ہوگا جو اس تصور کی افادیت سے انکار کرے گا ؟ آئینی اور قانونی لال بجھکڑ تو جب اس موضوع پر لب کشائی کرتے ہیں تو فصاحت و بلاغت کے امام بنے نظر آتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے اس اصطلاح کے نفاذ سے ہی محروم طبقوں کی تقدیر بدل جائے گی اور صوبے جنت بن جائیں گے۔
اگر آئینِ پاکستان کی ایسی تمام شقیں، آرٹیکلز اور ان کے ذیلی کلازز ایک جگہ جمع کر لیے جائیں جن میں صوبائی خود مختاری کا صاف اور واضح الفاظ میں ذکر موجود ہے، تو گمان ہوتا ہے کہ یہ کسی ایسی سیاسی جنت کا نقشہ کھینچا جا رہا ہے جہاں صوبوں کو مطلق العنان حقوق میسر ہوں گے۔ پاکستان کے آئین میں ایسی ایسی شقیں موجود ہیں جو بظاہر صوبوں کو وفاق کے اندر ایک **"سپر اسٹیٹ" (Super State)** کا درجہ دے دیتی ہیں۔ لیکن عوام کے لیئے یہ سب صرف ایک گمان، ایک فراڈ اور ایک سیاسی سراب ہے ، حقیقت اس کے بالکل برعکس اور انتہائی بھیانک ہے۔

آئینی لبادہ اور زمینی حقائق کا تضاد

آئین کا چوتھا شیڈول، آرٹیکل 70، اور خصوصاً اٹھارویں ترمیم کے بعد مشترکہ فہرست (Concurrent List) کا خاتمہ بظاہر صوبوں کو قانون سازی کی مکمل آزادی دیتا ہے۔ آرٹیکل 142 واضح کرتا ہے کہ جو امور وفاقی فہرست میں نہیں، ان پر قانون بنانے کا مطلق اختیار صوبوں کا ہے۔ مالیاتی محاذ پر آرٹیکل 160 (NFC Award) کے تحت کلاز **3A** یہ تحفظ فراہم کرتا ہے کہ صوبوں کا حصہ پچھلے ایوارڈ سے کم نہیں کیا جا سکتا۔ مزید برآں،

آرٹیکل 172(3) صوبے کی حدود میں نکلنے والے تیل اور گیس پر صوبائی اور وفاقی حکومت کی برابر کی ملکیت (50:50) کا مژدہ سناتا ہے۔
لیکن سیاسی حقیقت یہ ہے کہ صوبائی خود مختاری کا یہ پورا ڈھانچہ دراصل ایک ایسا لالی پوپ ہے جسے صوبائی حکمران حرامیہ نے اپنے اقتدار کو طول دینے، وفاق کو بلیک میل کرنے اور اپنی لوٹ مار کو آئینی تحفظ فراہم کرنے کے لیے استعمال کیا ہے۔

صلاحیت کا فقدان اور صوبائ حرامیہ کا کھیل

صوبائی خود مختاری کے اس غوغا میں اگر ہم پاکستان کے جغرافیائی اور سیاسی نقشے پر نظر ڈالیں تو تضاد کھل کر سامنے آتا ہے۔ بلوچستان اور خیبر پختونخوا (KP) جیسے صوبوں میں تو اتنی انتظامی و مالیاتی سکت ہی نہیں چھوڑی گئی کہ وہ اپنے آئینی اختیارات کو عوام کی فلاح کے لیے استعمال کر سکیں۔ وہ سیکیورٹی بحرانوں اور وفاق کی مرہونِ منت مالی امداد کے جال میں ایسے جکڑے ہیں کہ خود مختاری محض ایک خواب ہے۔
دوسری طرف، صرف پنجاب اور سندھ دو ایسے صوبے ہیں جنہوں نے "صوبائی خود مختاری" کے نام پر ایسا کھیل کھیلا ہے کہ شیطان کو بھی شرم آ جائے۔ پنجاب کی باری دیکھی جائے تو وہاں ن لیگ، ق لیگ اور پی ٹی آئی کی حکومتیں بدلتی رہیں، اور ہر ایک نے اس خود مختاری کو مرکز کے خلاف سیاسی سودے بازی اور اپنی بادشاہتیں قائم رکھنے کے لیے استعمال کیا۔

سندھ شریف کا 17 سالہ ماڈل: زرداری گینگ کا راج

پنجاب میں تو پھر بھی اقتدار کے چہرے بدلتے رہے، لیکن "سندھ شریف" کی داستانِ الم سب سے منفرد اور سنگین ہے۔ یہاں گذشتہ سترہ سالوں سے صرف اور صرف **"زرداری گینگ"** کی حکومت بلا شرکتِ غیرے راج کر رہی ہے۔
اس گینگ نے صوبائی خود مختاری کے تمام لالی پوپ خود کھائے ہیں اور عوام کو صرف بھوک، کچرے کے ڈھیر ، پسماندگی اور وڈیرہ شاہی کا جبر تحفے میں دیا ہے۔

جب بھی مرکز کی طرف سے ان کی بیڈ گورننس، کرپشن یا احتساب کی بات کی جاتی ہے، تو یہ حرامیہ فوراً " سندھ کارڈ " سندھو دھرتی پانچ ہزار سال والی داستان اور "صوبائی خود مختاری خطرے میں ہے" کا واویلا شروع کر دیتی ہے۔ کراچی جیسے معاشی انجن کے وسائل پر صوبائی قبضے کو برقرار رکھنے اور کراچی کی ترقی کا راستہ روکنے کے لیے اسی آئینی خود مختاری کو ڈھال بنایا جاتا ہے۔

آئینی منافقت: بلدیاتی اداروں کا قتلِ عام

صوبائی حکومتوں کی اس خود مختاری کا سب سے بڑا فراڈ اور منافقت اس وقت بے نقاب ہوتی ہے جب ہم نچلی سطح پر اختیارات کی منتقلی کا جائزہ لیتے ہیں۔ آئین کا **آرٹیکل A-140** ہر صوبے کو پابند کرتا ہے کہ وہ بلدیاتی نظام قائم کرے اور سیاسی، انتظامی اور مالیاتی اختیارات نچلی سطح پر عوام کے نمائندوں کو منتقل کرے۔

سندھ اور پنجاب کے حکمرانوں نے وفاق سے تو صوبائی خود مختاری کے نام پر بے تحاشہ پیسہ اور تمام اختیارات چھین لیے، لیکن جب وہی اختیارات اپنے ہی صوبے کے اضلاع، شہروں اور دیہاتوں کو دینے کی باری آئی تو سانپ سونگھ گیا۔ انہوں نے بلدیاتی اداروں کو فنڈز اور اختیارات سے محروم کر کے مفلوج کر دیا، کیونکہ یہ صوبائ حرامیہ اقتدار کی مرکزیت پر یقین رکھتی ہے، عوام کی خود مختاری پر نہیں ہے۔

حاصلِ کلام :

جیسے کسی طوائف کے کوٹھے پر ہر چیز کی بولی لگتی ہے، بالکل اسی طرح صوبائی سطح پر ترقیاتی فنڈز، سرکاری نوکریوں، اور ٹھیکوں کی بندر بانٹ ہوتی ہے۔ پنجاب میں تو کسی اسکول میں دو کمروں کی تعمیر کا ٹھیکہ بیس کروڑ میں دے دیا جاتا ھے کمرے تیار بھی ھو جاتے ھیں لیکن سندھ میں ٹھیکے کی منظوری اور رقم کی فراھمی کے باوجود دو کمرے صرف کاغذات میں بنتے ھیں ۔اٹھارویں ترمیم کے بعد تعلیم، صحت اور زراعت جیسے

کھربوں روپے کے شعبے صوبوں کو منتقل تو ہوئے، لیکن ان کا فائدہ ہسپتالوں اور اسکولوں کی شکل میں عوام کو ملنے کے بجائے وزراء، وڈیروں ، حکمرانوں کے دامادوں ، سسرالی رشتہ داروں اور ان کے چہیتے ٹھیکیداروں کی جیبوں میں چلا گیا جو دبئ کی پراپرٹیز کی شکل اختیار کر گیا ۔

پاکستان میں "صوبائی خود مختاری" کا راگ الاپنا محض ایک سیاسی ڈرامہ اور عوام کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کا ذریعہ ہے۔ جب تک خود مختاری کا مطلب سینیٹ یا صوبائی اسمبلیوں کے ہالوں سے نکل کر گلی محلوں کے عام آدمی کی مالی اور سیاسی خود مختاری نہیں بنتا، تب تک یہ نعرہ صرف صوبائی لٹیروں اور سیاسی گینگز کے لیے وفاق کو بلیک میل کرنے اور اپنے کرپشن ماڈل کو تحفظ دینے کا ایک "دلفریب اور منافقانہ لالی پوپ" ہی رہے گا ، اس لیئے **سندھ اور پنجاب کے این ایف ایوارڈ میں پچاس فیصد کمی کی جائے اور بقیہ پچاس فیصد براہ راست وفاق کے زیر انتظام کراچی و جنوبی پنجاب کو دیا جائے** ساتھ ھی طوائف کی نخریلی شرائط جیسی آئینی شقوں [160 (3A)] کو کچرے کے ڈبے میں پھینک دیا جائے ۔